مولانا محمد حنیف ندوی

اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت

عہدِ سحری (MAGIC AGE) میں جب کاہنوں اور شعبدہ طرازوں کا زور تھا، اللہ تعالیٰ نے جو انبیا مبعوث فرمائے، ان کو واضح طور پر حسّی معجزات اور خوارق سے نوازا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ جن اشخاص کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے وہ اگرچہ اس فسوں سازی اور شاطری کے قائل نہیں، جس کا اظہار جادوگروں اور ساحروں کے ذریعہ ہوتا ہے تاہم ان کا تعلق براہِ راست اس رب فاطر و قادر سے ہے جس نے اس بزمِ کون کو سجایا اور آراستہ کیا ہے۔ اسی نے قانونِ قدرت کو ترتیب دیا ہے اور وہی اس لائق بھی ہے کہ جب چاہے کسی بالاتر مصلحت کی خاطر اس قانون کو بدل دے۔ اس لیے کہ سب سے بڑا قانون تو خود اس کی ذاتِ گرامی ہے، اور اس ذاتِ گرامی کی صفتِ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ہر فرد کی ذہنی و فکری ظلمتوں کا مداوا کرے، اور دلائل و آیات کے پیش کرنے میں ان کی ذہنی سطح کا خیال رکھے۔

اسلام سے پہلے چونکہ سحر، جادو اور شعبدہ بازی کا معاشرہ میں چلن تھا اور لوگ اس سے بُری طرح متاثر بھی تھے۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ انبیا، رشد و ہدایت کا ایسا اسلوب اختیار کریں جس میں تعلیمات کے پہلو بہ پہلو معجزات و خوارق کا اظہار بھی ہوتا رہے، تاکہ عوام پر ان لوگوں کی چالاکی اور ابلہ فریبی کا راز فاش کیا جا سکے۔[1]

قرآن حکیم چونکہ اس عہدِ علم و نور کا نقیب و داعی تھا، جس میں انسانی اذہان و قلوب پر عقل و خرد کا آفتاب تازہ چمکنے والا تھا، اور سحر و کہانت کی دبیز تاریکیاں چھٹنے والی تھیں

---

[1] سیوطی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے: بنی اسرائیل میں چونکہ بصیرت کی کمی تھی۔ اس لیے انھیں حسی معجزات دکھائے گئے اور مسلمانوں میں چونکہ ذکا و فہم کی فراوانی جنم لینے والی تھیں اس لیے انھیں سراسر عقلی معجزہ دیا گیا۔ (اتقان جز ۲: ص ۱۱۶)

اس لیے معجزہ طلبی اور معجزہ نمائی کی اس روش کی حوصلہ افزائی ترک کردی گئی جو تھوڑی دیر کے لیے دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں تو ڈال سکتا ہے لیکن حق و باطل میں کسوٹی اور معیار کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ سے معجزہ طلب کیا گیا اور کہا گیا:

لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا ۝ او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانھٰر خللھا تفجیرا ۝ او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملٰئکۃ قبیلا ۝ او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ۝ ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتٰبا نقرؤہ ۝ [۲]

اور کہنے لگے ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ عجیب و غریب باتیں نہ دکھاؤ یا تو ہمارے لیے زمین میں سے چشمہ جاری کردو، یا تمھارا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔ اور ان کے بیچ میں نہریں بہا نکالو، یا جیسا تم کہا کرتے ہو، ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا گراؤ۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کوئی کتاب نہ لاؤ جسے ہم پڑھ بھی لیں۔

تو اس کے جواب میں قرآن ہی کی زبان میں آپ نے فرمایا:

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ۝ [۳]

کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے۔ میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں۔

اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ آنحضرتؐ کو خوارق و معجزات سے بہرہ مند ہی نہیں کیا گیا۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں کثرت سے آپؐ کے معجزات کا ذکر ہے۔ خصوصیت سے یہ آیت دیکھیے:

[۴] اقتربت الساعۃ وانشق القمر ۝ وان یروا اٰیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر ۝

اور چاند شق ہو گیا اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں کہ یہ ہمیشہ کا جادو ہے۔

اس نوع کی آیات سے دراصل مقصود یہ سمجھانا ہے کہ آنحضرت کی بعثت سے خرد و عقل کے نئے باب کا افتتاح ہونے والا ہے۔ یعنی تو ہم پرستی کا پرانا دور اختتام پذیر ہونے کو ہے۔

---

[۲] بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳ [۳] بنی اسرائیل: ۹۳ [۴] القمر: ۲

اور ایک نئی صبح کا طلوع ہو رہا ہے۔ انسان نے ماضی کے توہمات سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور مستقبل کی ضو فشانیوں میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ آنحضرت سے پہلے سحر و شعبدہ طرازی میں انسان کا معیار کمال یہ تھا کہ ایک کاہن اور پروہت کس درجہ کی فسوں سازی پر قدرت رکھتا ہے اور کس کس حیلے اور فریب سے سادہ لوح لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے یا عامۃ الناس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کیونکر انھیں حیران و ششدر کر سکتا ہے۔

آنحضرتؐ کی آمد سے دجل و فریب کی ان تمام صورتوں کا پردہ چاک ہوا۔ وحی و الہام اور عقل و خرد کے تقاضوں میں تضاد رفع ہوا، اور یہ بشر خاکی اس لائق ٹھہرا کہ علم و عرفان کے نئے نئے دروازوں پر دستک دے، اپنے مضمرات ارتقا کو بروئے کار لائے اور مہر و ماہ پر تسخیر کی کمندیں ڈالے اور بجائے اس کے کہ پیغمبروں کے ان معجزات کو دلیل و برہان کی صورت میں پیش کرے۔ اور دہرائے جن کی حیثیت اس دور میں بہرحال روایت سے زیادہ نہیں رہی، خود آگے بڑھے اور نفس و آفاق کی دنیا میں تغیر و تصرف کے ان نئے نئے تجربات سے دوچار ہو جو علم اور سائنس پر مبنی ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ [۵]

اور ہم عنقریب اطرافِ عالم میں اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے۔ کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔

معجزاتِ حسی کا دور اس بنا پر بھی ختم ہوا کہ گزشتہ قوموں نے انبیا کی تعلیمات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ان معجزات و خوارق کے مشاہدہ کے باوجود بدستور انکار و کفر کی راہوں پر گام فرسا رہے۔

وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَن كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ [۶]

---

[۵] حٰم السجدة: ۵۲ [۶] بنی اسرائیل ۵۹

اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لیے بند کر دیں کہ اگلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔

آنحضرتؐ نے جس نئے عصر کا آغاز کیا تھا اس کا تعلق چونکہ علم و عرفان کے معجزات سے تھا۔ اس لیے آپؐ نے قرآن کی زبان میں یقین و آگاہی کے اس سدا بہار دبستان کا حوالہ دیا، جس کی شمیم آرائیوں سے پورا عالم انسانی مہک اٹھا۔ دوسرے معنوں میں قرآن حکیم نے بتایا کہ حسیات میں معمولی تغیر و انقلاب سے متاثر ہونے والے کوتاہ نظر انسانو! آؤ۔ اس کتاب کی معجزہ طرازیوں پر غور کرو، جو اپنے الفاظ، اسلوب اور معنویت و تاثیر کے لحاظ سے ایسی عظیم اور حیران کن ہے کہ تنہا اس کو دنیائے علم و عرفان کا بہت بڑا معجزہ اور کرشمہ قرار دیا سکتا ہے:

وقالوا لولا انزل علیہ اٰیات من ربہ ط قل انما الاٰیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین ہ اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب علیھم ان فی ذالک رحمۃ وذکریٰ لقوم یومنون ہ[۶]

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں، کہ دو نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا ہدایت کرنے والا ہوں، کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مومنوں کے لیے اس میں رحمت و نصیحت ہے۔

ایک اہم سوال۔ قرآن کن معنوں میں معجزہ ہے زملکانی کا موقف

قرآن حکیم کن معنوں میں معجزہ ہے؟ اور ادب و لسان یا معنی و ترتیب کے کس کس پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔؟ یہ وہ سوال ہے جس نے مسلمانوں میں ادب و لسان کے ذوق کی تخلیق کی اور فصاحت و بلاغت اور بدیع و بیان کے نام سے مستقل فن کی بنیاد پڑی۔ اس فن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خالصتاً اسلامی ہے اور جذبہ خدمت قرآن کا پروردہ ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ یہ فن عربی میں ہے اور دینی چھاپ کا حامل ہے۔ لیکن اس میں نقد و تحسین کے جن پیمانوں کا ذکر ہے، وہ اپنے مزاج و وسعت کے اعتبار سے عالم گیر ہیں اور کسی بھی

---

[۶] العنکبوت ۵۰، ۵۱

زبان اور پیرایۂ بیان کی جانچ پرکھ کے سلسلے میں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ زملکانی، خطابی، سکاکی، جرجانی، رازی اور جاحظ ایسے ائمۂ ادب نے اس کی زلف و کاکل کے سنوارنے کی خدمت انجام دی ہے اور اسے اس لائق ٹھہرایا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم قرآن حکیم کی عظمت ادبی کا اندازہ کر سکیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ قرآن حکیم میں اعجاز کے کون کون سے پہلو خصوصیت سے شائستۂ التفات ہیں۔ ادب و لسان کے اداشناسوں نے مختلف موقف اختیار کیے ہیں[۵۷]

۱۔ زملکانی کا کہنا ہے کہ قرآن کا اعجاز، اس کے حسنِ تالیف میں مضمر ہے۔ یعنی اس کے مفردات اور معانی دونوں میں یہ خصوصیت پنہاں ہے کہ ان کے انتخاب میں صحت و آہنگ اور ترجمانی کے اعتبار سے اس مرتبہ و درجہ کو ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے جو بلند تر ہے[۵۸]

۲۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں اعجاز کا پہلو، وہ پیشین گوئیاں ہیں جن کا تعلق مستقبل سے ہے اور وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔ جیسے اہلِ بدر کے بارہ میں فرمایا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر[۵۹]

عنقریب یہ لوگ شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔

یا اہلِ ایران کے مقابلے میں رومیوں کی فتح کی اس وقت خبر دی جب کہ اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی:

الٓمّٓ ۔ غلبت الروم ۝ فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون ۝[۶۰]

الم ۔ اہلِ روم نزدیک ہی کے ملک میں مغلوب ہو گئے، اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے۔

۳۔ ایک رائے یہ ہے کہ وجہ اعجاز گزشتہ اقوام و ملل کے حالات و کوائف کو اس انداز

---

۵۷ تفصیل کے لیے دیکھیے: البرہان، ج ۱، ص ۹۳ تا ۱۰۱

۵۸ زملکان دمشق میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ ان کا پورا نام کمال الدین محمد بن علی بن الزملکانی ہے۔

۵۹ سورہ القمر: ۴۵ ۶۰ الروم ۱-۳

میں بیان کرتا ہے کہ گویا آنحضرت نے ان کو بچشم خود دیکھا ہے۔ حالانکہ مدت ہوئی تاریخ ان کو بھلا چکی تھی:

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ما كنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا [۱۱]

ان حالات کے بارہ میں خبروں کا تعلق غیب سے ہے جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔

۴۔ ایک مدرسۂ فکر یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ان سے نہ صرف مختلف قوموں کے حالات کو الف پر روشنی ڈالی، بلکہ معاصرین کی نفسیاتی کمزوریوں پر سے بھی پردہ اٹھایا، اور یہ بھی بتایا کہ ان کے دلوں میں کون کون سے خیالات و شبہات پرورش پا رہے ہیں:

اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا [۱۲]

اس وقت تم سے دو جماعتوں نے جی چھوڑ دینا چاہا۔

ويقولون فی انفسهم لولا يعذبنا الله بما نقول [۱۳]

اور یہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہیں تو جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر ہمیں سزا کیوں نہیں ملتی۔

جمہور اور دوسرے علمائے لغت کی رائے۔

۵۔ جمہور اہل علم کی رائے میں۔ قرآن میں بلاغت کا یہ پہلو اعجاز کا حامل ہے کہ اس کی نظم و ترتیب اور معانی کی استواریاں اس درجہ نمایاں ہیں کہ کوئی انسان ان کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کلام اس ذات گرامی کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کے دائرۂ علم و ادراک سے کوئی شی باہر نہیں، جو معانی کی صحت و بلندی سے بھی آگاہ ہے اور الفاظ کی موزونیت سے بھی پوری طرح باخبر۔

۶۔ فخر الدین رازی کا کہنا ہے۔ اس کا اعجاز، اس کی فصاحت و بلاغت اور ان تمام عیوب سے اور تضادات سے منزہ ہونا ہے جو انسانیت کا خاصہ ہیں۔

---

[۱۱] ہود: ۴۹ [۱۲] آل عمران: ۱۲۲ [۱۳] المجادلہ: ۸

۷۔ قاضی ابوبکر اپنی کتاب اعجاز القرآن میں رقم طراز ہیں کہ قرآن کے اعجاز میں یہ راز پنہاں ہے کہ اس کا اسلوب۔ اس دور کے تمام معروف و مروجہ اسالیب سے مختلف ہے۔ یعنی نہ تو یہ اس شعر کی طرح ہے اور نہ اس نثر کی طرح، جس کا اظہار اس دور کے فصحا اور شعرا اپنے کلام میں اکثر کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے طرزِ بیان کی اس طرفگی کو بخت و اتفاق کی کارسازی قرار دے کر ٹالا نہیں جا سکتا، بلکہ اس میں ایک خاص انداز کی تازگی، نکھار و نغمگی پائی جاتی ہے۔ ابداع، طرفگی اور ندرت کا یہ شاہکار بہرحال اس لیے ہے کہ اس کو بدیع السمٰوٰت و الارض کے کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۸۔ ابویعقوب یوسف بن ابی بکر محمد بن علی السکاکی نے اپنی کتاب مفتاح العلوم میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کوئی پہلو متعین کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ وہ قاری جو فصاحت و بلاغت کا صحیح علم و ذوق رکھتا ہے، اس کو ہر ہر قدم پر محسوس تو کرتا ہے مگر بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے نزدیک اس کی فصاحت و بلاغت سراسر ذوق و وجدان کے نازک پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اظہار اسی طرح ناممکن ہے جس طرح حسن و ملاحت کا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے، کیوں کہ یہ چیز محسوس کرنے کی ہے بیان کرنے کی نہیں۔ یا جس طرح کوئی بھی شخص نغمہ و صوت کے حسین اثرات کو الفاظ میں منتقل نہیں کر سکتا، ٹھیک اسی طرح قرآن کے حسن و زیبائی کی الفاظ و حروف کی اصطلاحوں میں تشریح نہیں کی جا سکتی۔

بندار بن الحسین کا نظریہ۔ قرآن ہر پہلو سے معجزہ ہے!

ابوحیان توحیدی نے اعجازِ قرآن سے متعلق بندار بن الحسین الفارسی کے جس قول کو بہت پسند کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ تعبیر و تشریح کا یہ وہ اسلوب ہے جو نہ صرف اچھوتا، نازک اور بدرجۂ غایت اونچا ہے بلکہ اس میں ان تمام وجوہِ اعجاز کو گھیر لیا گیا ہے جن سے قرآن کی عظمت کا احساس دلوں میں ابھرتا اور زندہ ہوتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ قرآن کا کون سا حصہ، پہلو یا مقام ایسا ہے جسے معجزہ قرار دیا جا سکے، مفتی کو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ سوال بعینہٖ اس نوعیت کا ہے جیسے کوئی شخص کسی مفتی سے پوچھ بیٹھے کہ جس معنی و مفہوم کو جوہرِ انسانیت سے

تعبیر کرتے ہیں اس کا تعلق جسم انسانی کے کس حصے سے ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ انسانیت ایک کل سے تعبیر ہے۔ لہذا اس کا تعلق اس پورے انسان سے ہے جس کو دیکھ کر ہم بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ انسان ہے۔ ٹھیک اسی طرح قرآن کے بارہ میں بھی ہم کسی مقام یا حصہ کا تعین نہیں کر سکتے، جو خصوصیت سے صنائع اعجاز کا حامل ہو۔ قرآن اگر معجزہ ہے اور یقیناً معجزہ ہے تو اپنے تمام پہلوؤں اور متضمنات کے ساتھ یعنی بغیر کسی تخصص اور تعیین کے قرآن کے الفاظ و حروف، ان کی تالیف و ترتیب، اس کے معانی، اس کا پیغام و دعوت، اور پھر پیغام و دعوت کی گیرائی، سچائی اور سادگی۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے قرآن حکیم تعبیر ہے۔ اس لیے اعجاز کا تعلق بھی اس قرآن کے عموم اور کلیت سے ہے۔ کسی مخصوص اور متعین پہلو سے نہیں۔ بنداربن الحسین الفارسی، کا یہ دعویٰ دراصل جمالیات کے اس مانے ہوئے اصول کا ترجمان ہے کہ کسی شئ کے حسن و رعنائی کا اندازہ اس تاثر و احساس سے ہوتا ہے جو اس شئ کے جملہ لوازم کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور اس مجموعی اور کلی تاثر کو تحلیل و تجزیہ کی اصطلاحوں میں ہرگز بیان نہیں کیا جا سکتا۔

الفرناصی کی رائے۔ قرآن کے اسلوب بیان کی یکسانی اور استمرار معجزہ ہے۔

۱۰۔ ابوالحسن حازم بن محمد القرناصی نے منہاج البلغاء میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ قرآن حکیم میں بلاغت و فصاحت کا ہونا ہی اس کے معجزہ ہونے کی دلیل نہیں۔ اصل کمال جس کو اعجاز کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ قرآن حکیم میں بسم اللہ سے والناس تک فصاحت و بلاغت کا یہ دریا، استمرار اور یکسانی کے ساتھ رواں دواں ہے اور کہیں بھی ایسا مقام یا مرحلہ نظر نہیں آتا جہاں جھول ہو یا جہاں عدم توازن یا معیار سے عدم مطابقت کا احساس پیدا ہو۔

حازم القرناصی دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کے تمام مضامین، تمام سور اور آیات میں فصاحت و بلاغت کے پیمانوں کی یکسانی اور استمرار کے ساتھ قائم رہنا ہی اس کے کلام خداوندی ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ جہاں تک انسانی کلام کا تعلق ہے، اس کے تمام شاہکاروں اور شاہ پاروں میں چاہے ان کا تعلق نظم سے ہو، چاہے نثر سے۔ ایسے مقامات اور مرحلے ضرور آتے

ہیں، جہاں اسلوب و معیار کی یکسانی قائم نہیں رہ پاتی اور اس کے نتیجے میں کہیں نہ کہیں اس میں جھول، بندش کی سستی اور عامیانہ پن کی جھلک ضرور فکر و نظر کے ناقدوں کو کھٹکتی ہے۔ بخلاف اس کتاب کے کہ اس میں مضمون توحید کا ہو، یا بعثت کا، قصہ انسانی عروج و زوال کے اصولوں کا ہو، یا قانون اور تشکیل انسانیت کا۔ ہر جگہ، اور ہر مقام پر ایک ہی رنگِ فصاحت، ایک ہی انداز بلاغت اور معیار حسن و جمال ہے جو جلوہ کناں نظر آتا ہے۔

وجوہ اعجاز کے بارہ میں النظام کا عجیب و غریب نظریہ 'صرفہ'۔

قرآن حکیم کے وجوہ اعجاز کا تجزیہ نامکمل رہے گا۔ اگر ہم ابو اسحاق ابراہیم بن سیار النظام کے نظریہ 'صرفہ' کا تذکرہ نہ کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم کا جواب یوں تو ممکن ہے۔ ناممکن اس وجہ سے ہے کہ جب بھی کوئی شخص یا گروہ اس کے جواب کے درپے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے قدرت و استطاعت چھین لیتا ہے۔ اور وہ اس لائق نہیں رہتا کہ اس کے مرتبۂ فصاحت کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہہ سکے۔ اس نظریہ پر باقلانی کا اعتراض بالکل بجا اور معقول ہے کہ اس صورت میں معجزہ قرآن تو نہ ہوا، وہ امتناع یا صرفہ ہوا۔ جس کے ذریعہ کسی شخص کو اس انداز کی طبع آزمائی سے بجبر روک دیا جاتا ہے۔ نظام کی اس اپج کو کور ذوقی ہی کہا جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس کے شاگرد رشید جاحظ نے اپنی کتاب "نظم القرآن" میں (جس کا حوالہ اس کی مشہور کتاب، کتاب الحیوان میں مذکور ہے) کھلے بندوں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلاشبہ قرآن حکیم کا اسلوب بیان معجزانہ خوبیوں کا حامل ہے

اس سلسلے میں اس نے وجوہ اعجاز کی تشریح کرتے ہوئے صفت ایجاز کی مثالیں خصوصیت سے پیش کی ہیں اور دکھایا ہے کہ قرآن حکیم کیونکر کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب سمو دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں نظام کے اس نظریہ کے بارے بجا طور پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن حکیم کے مخاطبین سے جواب کی صلاحیتیں چھین لی گئی ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے اور قرآن حکیم کی اس تحدی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی جس میں ان سب کو جواب کے لیے للکارا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم سب مل جل کر بھی کوشش کرو تو بھی اس تحدی کا جواب نہ دے پاؤ گے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھٰذا القراٰن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔[۱۴]

کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے، چاہے وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن حکیم اپنی ادبی و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے ہمہ اعجاز ہے اور بقول بندار بن الحسین کے اس کے بارے میں خصوصیت سے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ معنی و لفظ اور ترتیب و تالیف کے کس پہلو و مقام پر اعجاز کا اطلاق مکمل طور پر ہوتا ہے۔ حسن و جمال چیز ہی ایسی ہے جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ حسن و زیبائی محبوب کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ آنکھ زیادہ حسین ہے یا ناک ہونٹ زیادہ جاذبِ نظر ہیں، یا صراحی دار گردن، کمر اچھی ہے یا چال۔ یہی نہیں، اس کے ساتھ ساتھ اداہائے دل کش بھی تو ہیں جن کے بارہ میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون خصوصیت سے قلب و نظر کو گھائل کرنے والی ہے۔

پھر بھی بحث کے اس مرحلہ پر کہنا پڑے گا کہ قرآن حکیم حسن و جمال کے جن پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، ان کی جامعیت و وسعت تسلیم، مگر غور و فکر اور افادہ و استفادہ کی آسانی کے لیے کسی ایک متعین پہلو پر بہرحال روشنی ڈالنا ہی پڑے گی۔ یہ پہلو کونسا ہو سکتا ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے۔ قرآن کی زبان اور اس کی معنوی و لفظی طرفہ طرازیاں۔

بات یہ ہے کہ قرآن نے سحر اور جادو کے دور سے نکل کر عقل و خرد کے جس نئے دور کا آغاز کیا اور جس اولین قوم اور معاشرہ کو اپنا مخاطب ٹھہرایا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کتاب کے کلامِ الٰہی ہونے کے ثبوت میں ایسی وزنی دلیل سے کام لیا جاتا، جو ایک طرف تو عقلی ہو اور دوسری طرف ایسی ہو جس کے حسن و قبح کو وہ اچھی طرح جانچ پرکھ سکیں۔ ظاہر ہے یہ عربی زبان اور اس کی خصوصیات ہی ہو سکتی تھیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ عرب علوم و معارف کی گوناگونی اور فنونِ لطیفہ کے ذوق سے محروم تھے۔ لے دے کے ان کے پاس صرف زبان ایسی تھی کہ جس پر وہ فخر کر سکتے تھے

---

[۱۴] بنی اسرائیل : ۸۸ ۔

یا جس کے چٹخاروں سے وہ لطف اندوز ہو سکے تھے۔ اس کے بناؤ سنگھار میں انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کھپا دیا، کیونکہ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ اس کے ذریعہ یہ ان ایام ومعرکہ آرائیوں کی یاد تازہ کرتے جن سے ان کے قبیلے کا نام روشن ہوتا اور اسی کے بل پر اپنے دشمنوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکاتے۔ شوٹ ان نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ دوسروں کے ہاں تو زبانیں محض ذریعہ اظہار کا کام دیتی ہیں، لیکن عربوں کے نقطۂ نظر سے زبان و اظہار بجائے خود مقصد، اور نصب العین بھی ہے[۱۵] یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عربی زبان کو فصاحت و بلاغت کے ایسے سانچوں میں ڈھالا، اور اظہار و تبیین کے ایسے فراز تک اچھالا کہ دنیا کی کوئی بھی زبان اس معاملہ میں اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔

کیا عربی پسماندہ زبان ہے؟ مستشرقین کا اعتراض اور اس کا جواب

ہم بعض کوتاہ نظر اور ذوقِ ادب سے تہی مستشرقین کے اس دعویٰ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ عربی زبان بلند پایہ معانی و مطالب کے اظہار کے اعتبار سے پس ماندہ زبانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ یا یہ چونکہ ایسے لوگوں کی زبان ہے جو ابھی قبیلوی دور سے آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان معانی و مطالب تک ان کی رسائی کہاں ہو سکتی تھی جو تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ایک خاص موڑ پر پیدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ ان کے ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ شہد کے لیے قریب قریب اسّی الفاظ ہوں، تلوار کو پچاس سے زائد ناموں کے ساتھ پکارا جائے، سانپ کے دو سو[۲] نام ہوں اور مصائب و آلام کے لیے چار سو الفاظ پائے جائیں۔ لیکن بدوی زندگی میں یہ ممکن نہیں کہ ذخیرہ الفاظ قلب و ذہن اور مذہب و دین کے ان لطائف کو بھی گھیرے ہوئے ہو، جن کا تعلق زندگی کی ان طرفہ طرازیوں سے ہے جو تمدن کی آغوش میں ابھرتی اور اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی ہیں۔

ہم مستشرقین کی اس اپچ کو اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ نزول قرآن سے کچھ پہلے اس زبان میں واقعی علوم و معارف کا چرچا نہیں تھا اور اس کا دامن ان معارف سے یکسر تہی تھا

---

[۱۵] ڈاکٹری میننش آف اسلام۔

جو تہذیب و تمدن کے ارتقا سے ابھرتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن ماضی بعید میں کیا یہی وہ زبان نہیں تھی جس میں پہلے پہل حمورابی نے قانون کی تدوین کی اور سفر ایوب اور ہومر کی الیاذہ اور سنسکرت کی مہابھارت سے پیشتر دنیا کو شعر و خیال کی نزاکتوں سے آگاہ کیا۔ اور کیا یہ حقیقت لسانیات کے ماہرین سے مخفی رہ سکتی ہے کہ یہاں تک اس زبان کی ساخت یعنی صرف و نحو اور اشتقاق و تصرف کی وسعتوں اور ذخیرہ الفاظ کی فراوانیوں کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان اس کا لگا نہیں کھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا تراجم اور لغات کے تصور سے پہلی دفعہ اسی زبان کے ذریعہ آشنا ہوئی۔

عربی زبان کی یہی وہ خوبی اور حسن ہے جس کی وجہ سے یہ اس لائق ہوئی کہ آگے چل کر تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ اور تصوف سے متعلق ان تمام علوم و لطائف کو اپنے دامن میں سمیٹ لے جن کو خدمتِ قرآن کے جذبہ نے فروغ دیا۔ اور ہمیں کہنے دیجیے کہ اسی زبان میں سب سے پہلے فلسفہ تاریخ پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ گویا قانون، شعر اور فلسفہ کے آغاز کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ یہی نہیں۔ ان علوم و معارف کے ساتھ ساتھ اس نے اس فکری ورثہ کی بھی پوری پوری حفاظت کی جس کو یونانیوں نے ترتیب دیا۔

مستشرقین اس تاریخی حقیقت کے اعتراف میں آخر کہاں تک بخل و اخفا سے کام لیں گے کہ اگر عرب دانشور اور مصنفین آج سے ہزار برس پہلے ارسطو و افلاطون کے افکار و خیالات کو قلم و قرطاس کے حوالے نہ کرتے تو تہذیبِ مغرب کی یہ تمام گہما گہمی اور رونق معرضِ وجود میں نہ آتی جس پر مغرب کو بجا طور پر ناز ہے۔ (جاری)

گلستانِ حدیث : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ چالیس منتخب احادیث نبوی ﷺ کی تشریح ہے۔ ہر حدیث کے مضمون کی تائید میں دوسری احادیث اور قرآن کریم کی آیات سے ان کی مطابقت بہت دلنشیں انداز میں بیان کی گئی ہے صفحات ۲۰۸، قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ : ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور